سرسیّد کی تفسیر کا علمی جائزہ

مفتی سمیع الرحمٰن صاحب، استاذ جامعہ فاروقیہ، کراچی

سرسیّد احمد خان ۱۱؍اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی کے ایک سادات خاندان میں پیدا ہوئے، جو شاہجہاں کے عہد میں ہرات سے ہندوستان آکر بسا تھا اور سلاطین مغلیہ کے تحت کئی مناصب پر فائز رہا۔ سرسید کی ابتدائی تعلیم والدہ کی زیرنگرانی قدیم طرز پر ہوئی، دینی تعلیم کے لئے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے پوتے شاہ مخصوص اللہ اور مولانا مملوک علی نانوتویؒ سے زانوئے تلمّذ طے (تہہ) کئے، لیکن یہ سلسلہ متوسط کتابوں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ۲۲ سال کی عمر میں تھے کہ والدمحترم سیدمتقی داغِ مفارقت دے گئے۔ سید صاحب کسبِ معاش کے سلسلے میں اپنے خالو خلیل اللہ خان سے صدر امین دہلی میں عدالت کا کام سیکھ کر ملازم ہوگئے، پھر کچھ عرصہ کمشنر آگرہ کے دفتر میں نائب منشی کی کرسی پر براجمان رہے، اسی دوران مختاری کا امتحان دے کر دسمبر ۱۸۴۱ء منصفی کا چارج سنبھال لیا، یوں درجہ بدرجہ ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے عدالت میں جج کے عہدے پر فائز ہوگئے۔

حکومت برطانیہ کے نمک حلال رہے، ان کی ہر ادا پر دل وجان سے فدا تھے، جب ۱۸۵۷ء میں ''جہادِ حریت'' کا معرکہ گرم ہوا تو سرسید نے اپنے انگریز محسنوں کی جان ومال اور اقتدار کے تحفظ کے لئے ہراول دستے کا کردار ادا کیا اور مقدس جہاد کو بغاوت کا نام دے کر مجاہدینِ اسلام کی کردارکشی کا فریضہ بڑی تندہی سے انجام دیا۔ حکومت برطانیہ نے حسنِ خدمت کے صلے میں sir، hb (شاہی مشیر) اور kc (ہندوستان میں امن کا جج) کے خطابات دینے کے علاوہ دوپشتوں تک دوسو ماہانہ شاہی وظیفہ جاری کردیا۔ سرکاری ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد زندگی کی تمام توانائیاں علی گڑھ یونیورسٹی کی ترقی کے لئے وقف کردیں۔ عمر کے آخری حصہ میں ان کے روشن خیال صاحبزادے سیدمحمود جو شراب کے رسیا تھے، انہیں گھر سے باہر نکال

دیا، بالآخر ایک دوست کے ہاں پناہ لی اور اسی کے گھر سے ۲۸ مارچ ۱۸۹۸ء کو ان کا جنازہ نکلا۔

''تفسیر القرآن'' لکھنے کا پسِ منظر:

سرسید صاحب نے جس مسلمان معاشرے میں آنکھیں کھولیں، وہاں سیاسی اور اخلاقی انحطاط کے پہلو بہ پہلو عقل پرستی کی موجیں آب وتاب کے ساتھ رواں تھیں، مغرب کا فلسفۂ عقل دینی عقائد اور الٰہیات میں دخیل ہوکر مسلمانوں کے نظریات پر براہِ راست حملہ آور تھا، اس نازک صورتحال سے نکلنے کے دو راستے تھے:

۱...... : ایک یہ کہ عقلی مکر کو چیلنج کیا جائے، کیونکہ وہ انتہائی کمزور بنیادوں پر قائم ہے، اس کا دائرہ کار حواسِ خمسہ اور تجربات تک محدود ہے، اسے کسی طرح وحی میں دخل اندازی کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔

۲...... : دوسرا یہ کہ ان عقل پرستانہ افکار ونظریات کو جوں کا توں اپنا کر دینی عقائد کے پورے ڈھانچے کو توڑ موڑ کر اس پیمانے میں ڈھال لیا جائے۔

سرسید نے معتزلہ کی روش اختیار کرتے ہوئے اسی دوسرے راستے کا انتخاب کیا، چنانچہ ان کا دعویٰ تھا:

> ''جس مجموعہ مسائل واحکام واعتقادات وغیرہ پر فی زمانہ اسلام کا لفظ اطلاق کیا جاتا ہے، وہ یقیناً مغربی علوم (عقلیہ) کے مقابلے میں قائم نہیں رہ سکتا''۔ (۱)

مغربی علوم عقلیہ کے مقابلے میں اسلامی عقائد ومسائل کو زندہ جاوید رکھنے کی کیا صورت ہے؟ اس کا حل تجویز کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''یا تو ہم علوم جدیدہ کو باطل ثابت کریں یا پھر انہیں اسلام کے مطابق کر کے دکھائیں''۔ (۲)

موصوف دین اسلام کی بقا اور امت مسلمہ کی طرف سے یہ بھاری فرض چکانے کے لئے اٹھے اور اس کی ابتداء قرآن کریم کی تفسیر سے کی، یہ تھا تفسیر کا اصل محرک اور پسِ منظر۔ لیکن صد افسوس! اس تفسیر میں علوم جدیدہ کو تو مشرف بہ اسلام نہ کر سکے، البتہ دینی عقائد ومباحث کو تحریف وتاویل کے تمام زاویوں سے گزار کر علوم عقلیہ کے مطابق کرنے کے تمام جوہر دکھائے، اس لئے یہ کہنا بجا ہوگا کہ سرسید صاحب کی مسلمان قوم سے ہمدردی اور غم خواری کی مثال بالکل اس بوڑھی خاتون کی طرح تھی، جس نے ایک باز کے بال و پر اس جذبۂ ہمدردی میں تراش دیئے تھے کہ یہ اسے اذیت پہنچاتے ہوں گے۔

تفسیر القرآن کا علمی جائزہ:

سرسید صاحب کی تفسیر ''تفسیر القرآن'' کا نیا ایڈیشن ۱۹۹۸ء کا مطبوعہ ہمارے سامنے ہے، سولہ پاروں، سات حصوں، ایک ہزار تین سو اٹھاسی صفحات پر مشتمل، ایک ضخیم جلد کی صورت میں لاہور کے معروف طباعتی ادارے ''دوست ایسوسی ایٹس'' نے شائع کیا ہے۔

ترجمہ کے متعلق مولانا عبدالحق حقانیؒ کی رائے یہ ہے کہ یہ شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ ہے جو ذرا بدل کر لکھ دیا گیا ہے (۳)۔ سولہ پاروں کی اس تفسیر میں دینی عقائد کے بیشتر مباحث آگئے ہیں، احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم، آثارِ صحابہ کرامؓ کو نظرانداز کر کے تورات وانجیل کو ان پر ترجیح دی گئی ہے، کیونکہ ان کے بقول یہ کتابیں محرف شدہ نہیں ہیں، چنانچہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> ''اگرچہ میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی کتب مقدسہ میں تحریف لفظی کی ہے اور نہ علمائے متقدمین ومحققین اس بات کے قائل تھے''۔ (۴)

شاید اس طرزِ عمل کو دیکھ کر سرسید کے ایک پرانے رفیق نواب محسن الملک سید مہدی علی خان نے انہیں ''چھپا پادری'' قرار دیا (۵) دعویٰ پر دعویٰ باندھتے چلے جاتے ہیں، لیکن دلائل کی وادی میں اترنا پسند نہیں کرتے، کبھی رُخ ادھر مڑ بھی جائے تو لے دے کے تان اسی پہ آ کے ٹوٹتی ہے کہ یہ خلافِ عقل ہے یا خلافِ فطرت۔ اپنے مطلب کی برآوری کے لئے صوفیاء کے شطحیات، مبہم عبارات، ضعیف اقوال سے پوری طرح فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسلوب بیان رواں، لیکن سنجیدگی غائب ہے۔ علماء کو آڑے ہاتھوں لیا، جابجا ان پر فقرے کسے، جنت کا تذکرہ کس تمسخرانہ انداز میں کیا ہے، وہ بھی پڑھ لیجئے:

> ''یہ سمجھنا کہ جنت مثل ایک باغ پیدا ہوئی ہے، اس میں سنگِ مرمر کے اور موتی کے جڑاؤ محل ہیں، باغ میں شاداب وسرسبز درخت ہیں، دودھ وشراب وشہد کی ندیاں بہہ رہی ہیں، ہر قسم کا میواہ کھانے کو موجود ہے، ساقی وساقنیں نہایت خوبصورت، چاندی کے کنگن پہنے ہوئے جو ہمارے ہاں کی گھوسنیں پہنتی ہیں، شراب پلا رہی ہیں، ایک جنتی ایک حور کے گلے میں ہاتھ ڈالے پڑا ہے، ایک نے ران پر سر دھرا ہے، ایک چھاتی سے لپٹ رہا ہے، ایک نے لب جاں بخش کا بوسہ لیا ہے، کوئی کسی کونہ میں کچھ کر رہا ہے، کوئی کسی کونہ میں کچھ، ایسا بے ہودہ پن جس پر تعجب ہوتا ہے، اگر بہشت یہی ہے تو بے مبالغہ ہمارے خرابات اس سے ہزار درجہ بہتر ہیں''۔ (۶)

کسی بھی تفسیر کا منہج سمجھنے میں اس کے اصولِ تفسیر ہی بنیادی اہمیت رکھتے ہیں، کیونکہ ہر مفسر

انہیں بنیادوں پر اپنے افکار ونظریات کا شیش محل کھڑا کرتا ہے، سرسید نے بھی اہل سنت کے طریقِ تفسیر سے ہٹ کر پندرہ اصولوں پر مشتمل ایک رسالہ ''تحریر فی اصول التفسیر'' کے نام سے لکھا ہے، اسی کے چند اہم اور بنیادی اصولوں کا مختصر ناقدانہ جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

سرسید کے چند تفسیری اصول کا جائزہ:

اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسید نے تحریف وتاویل کا پری خانہ سجانے کے لئے رنگ وروغن کا اکثر وبیشتر سامان معتزلہ کے فکری ملبے سے مستعار لیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی کج فہمی کی ہر ادا میں رنگِ اعتزالی جھلکتا ہے، سرسید صاحب کا اہم اور بنیادی اصول یہ ہے کہ:

پہلا اصول:

''عقل کو نقل پر بہرصورت برتری حاصل ہوگی، تعارض کی صورت پیش آجائے تو ترجیح بھی عقل کو ہوگی''۔ (۷)

سرسید نے معتزلہ کے اس اصول کو انتہائی بے دردی سے استعمال کرکے دینی عقائد کے پورے ڈھانچے کو تبدیل کرکے رکھ دیا، مثلاً ملائکہ، جنات وشیاطین، جنت وجہنم، حشر ونشر، رؤیتِ باری تعالیٰ وغیرہ کا صرف اس لئے انکار کردیا کہ یہ چیزیں میزانِ عقل میں پوری نہیں اترتیں، کیونکہ عقل یہ تسلیم کرنے سے قاصر ہے کہ ملائکہ، جنات وشیاطین انسانوں سے میل جول رکھنے والی مخلوق ہو اور نظر نہ آئے، چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''قرآن مجید سے فرشتوں کا ایسا وجود جیسا کہ مسلمانوں نے اعتقاد کر رکھا ہے، ثابت نہیں ہوتا''۔ (۸)

''قرآن کریم میں ملائکہ سے مراد انسان کے قوائے ملکوتی اور شیطان سے مراد قوائے بہیمی ہیں''۔ (۹)

''جنات سے پہاڑی وجنگلی آدمی مراد ہیں''۔ (۱۰)

''جنت وجہنم کا تذکرہ درحقیقت معروف کو بجالانے اور نواہی سے بچانے کا ایک ترغیبی حربہ ہے''۔ (۱۱)

رؤیتِ باری تعالیٰ کے متعلق لکھتے ہیں:

''خدا کا دیکھنا دنیا میں نہ ان آنکھوں سے ہوسکتا ہے اور نہ ان آنکھوں سے جو دل کی آنکھیں کہلاتی ہیں اور نہ قیامت میں کوئی شخص خدا کو دیکھ سکتا ہے''۔ (۱۲)

''نبوت فطری امر ہے''۔ (۱۳)

''حشر اجساد مثالی ہوگا''۔ (۱۴)

''چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزا وحشیانہ ہے، اس کی اجازت صرف اس وقت تک ہے جب ملک میں قید خانے نہ ہوں''۔ (۱۵)

''قتال صرف اپنی ذات کے دفاع میں کیا جا سکتا ہے''۔ (۱۶)

''امراء سے سود لینے میں کوئی حرج نہیں''۔ (۱۷)

الحاد اور بے دینی کی یہ عمارت اسی اصول پر قائم ہے کہ عقل کو نقل پر بہر صورت ترجیح ہوگی۔

دوسرا اصول:

سرسید کا دوسرا بڑا اہم اصول یہ ہے کہ اس کاروبارِ دنیا کا ہر فعل تعلیل وتسبیب کے ہمہ گیر قانون پر استوار ہے (۱۸) ذرّہ سے لے کر پہاڑ تک، قطرہ سے لے کر سمندر تک کوئی چیز اس سے مستثنیٰ نہیں، کائنات کے ہر حصہ میں اسی قاعدے اور قانون کی حکمرانی ہے، یہ ایسا اٹل قانون ہے کہ اس کا انحراف خدا بھی نہیں کرسکتا (۱۹) سرسید صرف اسے قانونِ فطرت سے تعبیر کرتے ہیں، اس نظریہ کی بنیاد پر انہیں نیچری کہا جاتا ہے، سرسید نے اس اصول سے سب سے پہلا وار معجزات و کرامات پر کیا، کیونکہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک یہ تمام امور علّت معلول کی قید سے آزاد ہوکر خرقِ عادات کے طور پر اس دنیائے آب و گل میں وجود پذیر ہوتے ہیں، لیکن سرسید صاحب خود ساختہ قانونِ فطرت کے پیشِ نظر ان خرقِ عادات امور کو تسلیم نہیں کرتے، ان کا دعویٰ ہے کہ قرآن مجید میں کسی معجزے کا ذکر نہیں (۲۰) اس دعویٰ سچا ثابت کرنے کے لئے جو طرز و طریقہ اختیار کیا ہے، اس کے ڈانڈے تحریف سے جا ملتے ہیں، مثلاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج جسمانی نہیں، روحانی اور منامی ہوا تھا (۲۱) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش قانونِ فطرت کے مطابق والد کی موجودگی میں ہوئی تھی (۲۲) انہیں آسمان پر اٹھائے جانے کا تعلق جسم سے نہیں، روح اور درجات سے تھا (۲۳) حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا ہی نہیں گیا، بدر کے میدان میں ملائکہ کے براہِ راست شریک ہونے کی کوئی حقیقت نہیں (۲۴) حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اپنی قوم کو لے کر دریا پر پہنچے تو اس وقت اتفاقاً دریا کا پانی اترا ہوا تھا، اس لئے سلامت گزر گئے، جب فرعون بمع لشکر کے دریا میں اترا تو اس وقت پانی چڑھا ہوا تھا، اس لئے غرقاب ہوگیا (۲۵)۔

تحریف کے یہ نمونے سرسید کے خودساختہ ''اصولِ فطرت'' نے جنم دیئے، ان خرقِ عادات امور کو فطرت میں ڈھالنے کے لئے سرسید کی عقلِ نارسا نے تحقیق کے جن زاویوں سے کام لیا ہے، اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، مثلاً قرآنِ کریم میں بصراحت مذکور ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکمِ الٰہی سے ایک مخصوص پتھر پر لاٹھی ماری تو اس سے پانی کے بارہ چشمے پھوٹ

پڑے: ''فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاکَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْناً''۔ (۲۶) تو ہم نے کہا: مار اپنے عصا کو پتھر پر سو بہہ نکلے اس سے بارہ چشمے (۲۷)۔ اس معجزے کو قانونِ فطرت میں ڈھالنے کے لئے سرسید صاحب نے جو خامہ فرسائی کی ہے، اسے بھی ملاحظہ فرمائیں:

> ''حجر کے معنی پہاڑ کے ہیں اور ضرب کے معنی رفتن (چلنا) پس صاف معنی ''اضْرِبْ بِّعَصَاکَ الْحَجَرَ'' کے ہوئے اپنی لاٹھی کے سہارے پہاڑ پر چل، اس پہاڑ کے پرے ایک مقام ہے جہاں بارہ چشمے پانی کے تھے، خدا نے فرمایا: ''فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْناً'' یعنی اس سے پھوٹ نکلے بارہ چشمے''۔ (۲۸)

عربی زبان سے شُد بُد رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ ''حجر'' بول کر پہاڑ مراد نہیں لیا جاتا اور ''ضرب'' بمعنی رفتن (چلنا) اس وقت ہوتا ہے جب کے صلہ میں لفظ ''في'' ہو لیکن سرسید صاحب کو قاعدے اور قانون سے کیا واسطہ؟ انہیں تو فقط اپنا مطلب نکالنا ہے، اگر چہ وہ ''شوربے کی تحقیق'' کی صورت میں نکل رہا ہو ''شوربے سے روٹی کھانے'' کے مفہوم سے ہر عام و خاص واقف ہے، لیکن اگر کوئی سر پھرا اس کی لغوی تحقیق میں جُت کر یہ دعویٰ کر ڈالے کہ اس کا مطلب کھارے پانی سے روٹی کھانے کے ہیں، کیونکہ شوربہ ''شور'' اور ''آب'' سے مرکب ہے، ''شور'' کھارے اور ''آب'' پانی کو کہتے ہیں، بتایئے! اس مسخرے پن کو تحقیق کا نام دیا جاسکتا ہے؟۔

تیسرا اصول:

سرسید صاحب کا تیسرا اصول یہ ہے کہ تفسیر کے لئے حدیثِ رسول، آثارِ صحابہ کرامؓ اور مفسرین کے اقوال کی چنداں حاجت نہیں (۲۹) چنانچہ سرسید کی معتبر سوانح ''حیاتِ جاوید'' جسے علامہ شبلی نعمانیؒ نے ''مدلّل وحی'' قرار دیا (۳۰) میں الطاف حسین حالی لکھتے ہیں:

> ''پس انہوں نے جیسا کہ حضرت عمرؓ سے منقول ہے: ''حسبنا کتاب اللّٰہ'' کہہ کر اپنے جدید علم کلام کا موضوع اور اسلام کا حقیقی مصداق صرف قرآن مجید کو قرار دیا اور اس کے سوا تمام مجموعۂ حدیث کو اس دلیل سے کہ ان میں کوئی حدیث مثل قرآن کریم کے قطعی الثبوت نہیں ہے اور تمام مفسرین کے اقوال و آراء اور تمام فقہاء، مجتہدین کے قیاسات و اجتہادات کو اس بنا پر کہ ان کے جواب وہ خود علماء مفسرین اور فقہاء مجتہدین ہیں نہ کہ اسلام، اپنی بحث سے خارج کردیا، اسی اصول کو ملحوظ رکھ کر سرسید نے قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کا مصمّم ارادہ کرلیا''۔ (۳۱)

سرسید نے اس تفسیری جدّت طرازی میں تمام معتزلہ کو بھی پیچھے چھوڑ دیا، یہی وجہ ہے کہ وہ

کسی آیت کی تفسیر آثارِ صحابہؓ سے کجا، حدیثِ رسول ﷺ سے بھی نہیں کرتے۔

چوتھا اصول:

سرسید نے صفاتِ باری تعالیٰ کو عین ذات باری تعالیٰ قرار دے کر معتزلہ کی ہمنوائی کی ہے اور اصولِ تفسیر میں اسے ایک ''اصل'' کے طور پر ذکر کیا ہے (۳۲) حالانکہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک صفات باری تعالیٰ واجب الوجود کے مفہوم سے زائد ہیں، عین ذات باری تعالیٰ نہیں ہیں، یہ ہیں سرسید کی تفسیر کے چند اہم اور بنیادی اصول، جن پر الحاد و بے دینی کی پوری عمارت کھڑی ہے، ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری نے بجا فرمایا کہ:

> ''اس صدی کی بے دینی، بے راہ روی اور بدعقیدگی کے تمام ڈانڈے سرسید سے ملتے ہیں''۔ (۳۳)

یہ ایک واقعہ ہے کہ پرویزی، خاکساری، فکری، غامدی سمیت ہر قافلہ راہ گم کردہ کی علمی بنیادیں سرسید کے تفسیری اوراق اور تہذیب الاخلاق کے مقالات میں بآسانی تلاش کی جاسکتی ہیں، تجدد پسندی کے یہ تمام طبقے ایک ہی تسبیح کے دانے ہیں جو ہر زمانہ کی ''عقلی'' سطح کے ساتھ گھومتے چلے جاتے ہیں۔

سرسید کی تفسیر پر چند اہلِ علم کے تبصرے:

۱...... سرسید کے دوست نواب سید مہدی علی خان ایک خط میں سید صاحب کو مخاطب ہیں:

> ''آپ نے مسلمان مفسروں کو تو خوب گالیاں دیں اور برا بھلا کہا اور یہودیوں کا مقلد بتایا مگر آپ نے خود اس زمانے کے لامذہبوں کی باتوں پر ایسا یقین کرلیا کہ ان کو مسائل محققہ، صحیحہ یقینہ قرار دے کر تمام آیتوں کو قرآن کے مؤول کردیا اور لطف یہ کہ آپ اسے تاویل بھی نہیں کہتے (تاویل کو تو آپ کفر سمجھتے ہیں) بلکہ صحیح تفسیر اور اصلی تفسیر قرآن کی سمجھتے ہیں، حالانکہ نہ سیاقِ کلام، نہ الفاظِ قرآنی، نہ محاوراتِ عرب کی اس سے تائید ہوتی ہے''۔ (۳۴)

۲...... مولانا عبدالحق حقانیؒ اپنی ''تفسیر حقانی'' کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں:

> ''دراصل یہ کتاب تحریف القرآن ہے، نہ کہ تفسیر (۳۵)''۔

چنانچہ حقانی صاحبؒ جا بجا اسے ''تحریف القرآن'' کے نام سے ہی یاد کرتے ہیں۔

۳...... تفسیر القرآن پر سرسید کے دوستوں کا ردِّعمل کیا تھا؟ یہ الطاف حسین حالی کی زبانی سنئے:

> ''آخر عمر میں سرسید کو باوجود وثوق کے ان کو اپنی رائیوں پر تھا وہ حد اعتدال سے متجاوز ہوگیا تھا، بعض آیاتِ قرآنی کے وہ ایسا معنی بیان کرتے تھے جن کو سن

کر تعجب ہوتا تھا کہ کیونکر ایسا عالی دماغ ان کمزور اور بودی تأویلوں کو صحیح سمجھتا ہے، ہر چند کہ ان کے دوست ان تأویلوں پر ہنستے تھے، مگر وہ کسی طرح اپنی رائے سے رجوع نہ کرتے تھے''۔ (۳۶)

۴......: ڈپٹی نذیر احمد دہلوی سرسید کی تفسیر پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجھ کو ان کے معتقدات بأسرہا تسلیم نہیں، سید احمد خان کی تفسیر ایک دوست کے پاس دیکھنے کا اتفاق ہوا، میرے نزدیک وہ تفسیر ''دیوانِ حافظ'' کی ان شروح سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جن کے مصنفین نے جوڑتوں سے کان گانٹھ کر سارے دیوان کو کتابِ تصوف بنانا چاہا، جو معانی سرسید احمد خان صاحب نے منطوق آیات قرآنی سے اپنے پندار میں استنباط کئے اور میرے نزدیک زبردستی مڑھے اور چپکائے، قرآن کے منزل من اللہ ہونے سے انکار کرنا سہل ہے اور ان معانی کو ماننا مشکل......... یہ وہ معانی ہیں جن کی طرف نہ خدا کا ذہن منتقل ہوا، نہ جبرئیل حاملِ وحی کا، نہ رسول ﷺ کا، نہ قرآن کے کاتب و مدوّن کا، نہ اصحابؓ کا، نہ تابعینؒ کا، نہ تبع تابعینؒ کا، نہ جمہور مسلمین کا''۔ (۳۷)

۵......: محدث العصر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ نے ''یتیمۃ البیان'' میں سرسید کو ''غلاۃِ معتزلہ'' میں شمار کیا ہے۔ (۳۸)

''تفسیر القرآن'' کی تردید پر مشتمل چند اہم کتابیں وتفاسیر:

۱......: سرسید کی تحریفات سے پردہ اُٹھانے والی پہلی شخصیت سید ناصرالدین محمد ابوالمنصور کی ہے، جنہوں نے سرسید کی تردید میں ''تنقیح البیان'' لکھی جو ۱۲۹۷ھ میں نصرۃ المطابع دہلی میں شائع ہوئی۔

۲......: سرسید کے فلسفہ ''تفوقِ عقل'' کی تردید میں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ایک مکتوب سرسید کو لکھا جو سات صفحات پر مشتمل تھا، ''تصفیۃ العقائد'' کے نام سے شائع ہوا۔

۳......: علامہ عبدالحق حقانیؒ نے تفسیر حقانی کے مقدمہ میں سرسید کے افکار ونظریات پر شاندار تنقید فرمائی ہے، یہ مقدمہ دو سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے، اسی طرح ایک غیر مقلد عالم سید احمد حسنؒ نے اپنی تفسیر ''احسن التفاسیر'' کے مقدمہ میں سرسید کی تردید پر مختصر مگر جامع مانع بحث کی ہے۔

۴......: مولوی ثناء اللہ امرتسریؒ نے تفسیر ثنائی میں سرسید کی تحریفات کا جواب عقلی اور نقلی طریقے سے دیا ہے۔

۵......: ایک شیعہ مفسر ابو عمار علی نے بھی سرسید کی تردید میں ''عمدۃ البیان'' کے نام سے

ایک تفسیر لکھی۔

۶ ...... : علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ نے ''یتیمۃ البیان'' میں سرسید کی تفسیر اور اس کے افکار و نظریات پر جامع و مانع تبصرہ فرمایا ہے۔

۷ ...... : مولانا سید تصدق بخاری مدظلہ نے ''محرّفِ قرآن'' نامی کتاب میں سرسید کی تفسیر پر ناقدانہ تجزیہ پیش کیا ہے۔

۸ ...... : حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے بھی اسی سلسلہ میں ایک کتاب ''الانتباهات المفيدة عن الاشتباهات الجديدة'' کے نام سے تالیف فرمائی جو حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے مجازِ بیعت مولانا مصطفیٰ خان بجنوریؒ کی تشریح اور تسہیل کے ساتھ ''اسلام اور عقلیات'' کے نام سے شائع ہوچکی ہے۔ عقل ونقل کا دائرۂ کار اور ان دونوں میں تعارض وترجیح کی صورتوں پر جن جواہر ریزوں کو صفحاتِ قرطاس پر بکھیرا ہے، اسے پڑھ کر ابن تیمیہؒ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے، جنہوں نے ''بيان موافقة صريح المعقول لصحيح المنقول'' میں عقل پرستوں پر نقد واحتساب کا دبستان سجا کر واضح کردیا تھا کہ:

فلسفہ چوں اکثرش باشد ''سفہ'' پس کل آں
ہم ''سفہ'' باشد کہ حکمِ کل، حکمِ اکثر است

حکیم الامتؒ کی یہ کتاب سرسید کے ''فلسفۂ تفوقِ عقل'' کے جواب میں بلاشبہ حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔

مراجع ومصادر

۱۔ حیاتِ جاوید ۱/ ۲۲۵ بحوالہ سرسید کی کہانی ان کی اپنی زبانی، ص: ۱۰۷
۲۔ پاکستان کا معمار اول سرسید، ص: ۵۵، طلوع اسلام، لاہور
۳۔ تفسیر حقانی ۱/ ۲۲۶، بیت العلم، لاہور
۴۔ تفسیر القرآن، سرسید سورۂ فاتحہ، ص: ۵
۵۔ نقش سرسید، ضیاء الدین لاہوری، ص: ۲۷
۶۔ تفسیر القرآن، حصہ اول، ص: ۴۴
۷۔ تحریر فی اصول التفسیر الاصل الخامس عشر، ص: ۳۱ تفسیر القرآن، حصہ ششم، ص: ۱۱۸
۸۔ تفسیر القرآن، سورۂ بقرہ، حصہ اول، ص: ۵۵
۹۔ تفسیر القرآن، سورۂ بقرہ، حصہ اول، ص: ۵۶
۱۰۔ تفسیر القرآن، سورۂ انعام، حصہ سوم، ص: ۶۵، ۶۶، ۶۷
۱۱۔ تفسیر القرآن، سورۂ بقرہ، حصہ اول، ص: ۴۵، ۴۶

۱۲۔ تفسیر القرآن، سورۂ اعراف، حصہ سوم، ص: ۲۰۴
۱۳۔ تفسیر القرآن، سورۂ انعام، حصہ سوم، ص: ۴۹
۱۴۔ تفسیر القرآن، سورۂ انعام، حصہ سوم، ص: ۱۰۹
۱۵۔ تفسیر القرآن، سورۂ مائدہ، حصہ دوم، ص: ۱۳۱-۱۳۵
۱۶۔ تفسیر القرآن، سورۂ بقرہ، حصہ اول، ص: ۲۴۸
۱۷۔ تفسیر القرآن، سورۂ بقرہ، حصہ اول، ص: ۱۱۶
۱۸۔ تحریر فی اصول التفسیر، الاصل الثامن، ص: ۲۱-۲۵
۱۹۔ تحریر فی اصول التفسیر، الاصل الثامن، ص: ۲۱
۲۰۔ تحریر فی اصول التفسیر، الاصل التاسع، ص: ۲۵
۲۱۔ تفسیر القرآن، سورۂ بنی اسرائیل، حصہ ششم، ص: ۸۶
۲۲۔ تفسیر القرآن، سورۂ ال عمران، حصہ دوم، ص: ۱۴
۲۳۔ تفسیر القرآن، سورۂ ال عمران، حصہ دوم، ص: ۳۵
۲۴۔ تفسیر القرآن، سورۂ ال عمران، حصہ دوم، ص: ۵۰
۲۵۔ تفسیر القرآن، سورۂ بقرہ، حصہ اول، ص: ۹۲
۲۶۔ البقرۃ: ۶۰
۲۷۔ ترجمۂ شیخ الہند رحمہ اللہ
۲۸۔ تفسیر القرآن، سورۂ بقرہ، حصہ اول، ص: ۱۱۷
۲۹۔ تحریر فی اصول التفسیر، الاصل التاسع، ص: ۲۷
۳۰۔ نقشِ سرسید، ضیاء الدین لاہوری، ص: ۲۷
۳۱۔ حیاتِ جاوید، بحوالہ سرسید کی کہانی ان کی اپنی زبانی، ص: ۵۷، طلوع اسلام، لاہور
۳۲۔ تحریر فی اصول التفسیر، الاصل السابع، ص: ۳۱
۳۳۔ مقدمہ سرسید کی کہانی ان کی اپنی زبانی، ص: ۲۲
۳۴۔ تفسیر القرآن، مکتوب نواب سید مہدی علی خان، ص: ۳
۳۵۔ مقدمہ تفسیر حقانی، ص: ۲۲۶
۳۶۔ حیاتِ جاوید، بحوالہ نقشِ سرسید ضیاء الدین لاہوری، ص: ۲۸
۳۷۔ موعظہ حسنہ، ص: ۱۷۵، بحوالہ نقشِ سرسید، ص: ۲۹
۳۸۔ یتیمۃ البیان لمشکلات القرآن، ص: ۳۳

☆☆......☆☆